حصہ غزل

(امتحانی نقطہ نظر سے)

غزل کے اشعار کی تشریح کے لیے ہدایات:

غزل کے معنی ہیں ''عورتوں سے گفتگو کرنا' عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف کرنا'' (بحوالہ فیروز اللغات صفحہ 979) شکار کے وقت ہرن کے منہ سے نکلنے والی دردناک آواز کو بھی غزل کہتے ہیں۔ سال اوّل کے پرچہ میں غزلیات میں سے دس نمبرات پر مشتمل تین اشعار آتے ہیں۔ نمبرات کی تقسیم حسب ذیل ہے۔

شاعر کا نام:	1 نمبر
تین اشعار کی تشریح:	9 نمبر

1۔ غزل کے ہر شعر کی تشریح الگ الگ کرنی چاہیے کیوں کہ غزل کا ہر شعر دوسرے سے موضوع اور مفہوم کے اعتبار سے منفرد ہوتا ہے۔

2۔ تشریح سے قبل تشریح طلب شعر ضرور لکھنا چاہیے۔

3۔ جوابی کاپی پر شاعر کا نام لکھنا نہ بھولیں۔ شاعر کے نام کا املاء درست ہو۔ اصل نام لکھنے کی شکل میں مکمل لکھنا چاہیے تاہم تخلص لکھ دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔

4۔ غزل کے ہر شعر کی معیاری تشریح دو صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔

5۔ دورانِ تشریح اقوال، آیات، احادیث اور موزوں اشعار وغیرہ کا موقع محل کے مطابق استعمال تشریح کو مؤثر اور مدلل بنانے کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اُردو کے علاوہ دوسری زبان کے حوالے کی صورت میں چھوٹی بریکٹ میں اُردو ترجمہ بھی ضروری ہے۔ حوالے کو مفہوم سے جوڑ کر بیان کرنا چاہیے۔ حوالہ جات تشریح میں مناسب موقع پر استعمال نہ ہوتے ہوں تو آخر میں لکھ دیے جائیں۔ مزید برآں حوالے غلط نہ ہوں۔ غلط لکھنے سے نہ لکھنا بہتر ہے۔

6۔ غزلیات کے اشعار متنوع اور ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا تمام پہلوؤں سے اسے پرکھنا چاہیے۔

7۔ غزلیات کے اشعار میں شاعر ہمیشہ تیسرے شخص یا عاشق کی ترجمانی کرتا ہے۔ لہٰذا کسی تیسرے شخص یا عاشق کے لحاظ سے اس کی تشریح کرنی چاہیے۔ تاہم بعض اوقات شعر میں شاعر کا ذاتی پس منظر، نجی حالات اور ذاتی واقعات بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔

حصہ غزل

(1) میر تقی میر

(۱۷۲۳ء۔۱۸۱۰ء)

تعارف: اصل نام محمد تقی اور میر تخلص تھا۔ ۱۷۲۳ء میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کا تعلق حجاز مقدس سے تھا۔ سادات خاندان سے تعلق تھا اور والد میر متقی درویش کامل انسان تھے، جو بچپن میں میر کو کہتے تھے کہ "اے پسر عشق بورز" یعنی اے بیٹے عشق اختیار کر وایام بچپن میں یہ الفاظ میر کی زبان پر ابھی راسخ نہ ہوئے تھے کہ میر متقی ہزاروں من مٹی کے نیچے جا چھپے۔ اب میر کی پرورش اُن کے منہ بولے چچا میر امان اللہ نے کی۔ قسمت کی یاوری دیکھیے کہ اُن کا ساتھ بھی زیادہ دیر تک نہ رہا۔ اب ایک کم سن میر اس دنیا میں اکیلا فکر معاش کے لیے پریشان ہو گیا۔ بچپن میں پیاروں کو قبر میں اترتے دیکھا تو دل پر اُس کا گہرا اثر ہوا۔ جائیداد پر سوتیلے بھائیوں نے قبضہ کر لیا اور اپنے ماموں سراج الدین علی خان آرزو کی بدسلوکی سے طبیعت جنونی ہو گئی۔ نازک طبعی نے کہیں بھی سکھ کا سانس نہ لینے دیا۔ ۱۸۱۰ء میں لکھنو میں انتقال کیا اور جہاں میر کی قبر تھی وہاں اب ریلوے لائن بچھا دی گئی ہے۔

میدان شاعری میں ہمیں غالب اور اقبال کے منکرین بھی مل جاتے ہیں، لیکن خدائے سخن میر تقی میر کا کوئی بھی منکر نظر نہیں آتا۔ ہر دور میں انھیں استاد شاعر تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ دلی کے اجڑنے پر دلی کو چھوڑا لیکن دلی کی یاد دل میں ناسور بن کر رہ گئی۔ میر کے کمزور کندھے دلی کی تہذیب کو گرنے سے تو نہ روک سکے البتہ اپنے اشعار میں سمو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ کر گئے۔ آپ کی تصانیف میں چھے دواوین، فارسی دیوان "تذکرہ نکات شعراء اور آپ بیتی" "ذکر میر" کے علاوہ ۳۷ مثنویاں اہم ہیں۔

بے دماغی، بے قراری، بے کسی، بے طاقتی
کیا جیے وہ روگ جن کے جی کو یہ اکثر رہیں

اعلیٰ تغزل اور سہل ممتنع ان کی غزل کے اہم عناصر ہیں۔

غزل۔1

شعر 1: جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا — کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

(بہاول پور 2009، ڈی جی خان 09,10، ملتان 06,08)

حل لغت: تاج وری: سر پر تاج پہننا، بادشاہی — نوحہ گری: کسی کی موت پر ماتم کرنا، رونا پیٹنا

مفہوم: جس شخص کو آج شہنشاہی کا غرور ہے وہ سن لے کہ کل اس کی موت پر لوگ ماتم کر رہے ہوں گے۔

تشریح:

غزلیاتِ میر سادگی و اختصار کا حسین امتزاج، دہلوی طرز سخن کی آئینہ دار اور جذبات و احساسات کی ترجمان ہیں۔ تشریح طلب شعر میں میر تقی میر نے ایک آفاقی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ شعر میں بادشاہوں کو انتباہی لہجے میں آگاہ کرتے ہیں کہ تمھارا اپنے سر پر تاج دیکھ کر پھولے نہ سمانا، تخت پر بیٹھ کر متکبر بننا اور بادشاہت کا غرور سب فانی ہے۔ یہ انسانی سرشت کا حصہ رہا ہے کہ جب بھی اسے اقتدار نصیب ہوتا ہے تو وہ اپنی چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلانے لگتا ہے۔ کسی کو خدا قبیلے کی سرداری دے تو وہ شہر کو اپنے زیر نگیں سمجھتا ہے۔ شہر کا حاکم ملک کا بادشاہ بننے کا متمنی ہوتا ہے اور جسے خدا عالمی حکومت دے تو وہ نشہ حکومت

اور غرور میں اس قدر سرشار ہوتا ہے کہ خدائی کا دعویٰ کر کے خدا کے مقابل صف آرا ہوتا ہے۔ نمرود دنیا کا حاکم تھا لیکن خدائی کا دعویٰ کیا تو مچھر کے ہاتھوں خاک میں مل گیا۔

انسان یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ ابدی حیات کا مالک تو صرف خدا ہی ہے۔ اپنے اقتدار کی ڈینگیں مارتے ہوئے یہ شہنشاہ موت کو بھول جاتے ہیں اور چار دن کی زندگی کو چار سو برس تصور کرنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ قرآن حکیم نے کئی سو برس قبل ہی ساری کائنات کے فنا ہونے کا تصور دیا تھا۔ بقول جاوید انجم لائل پوری:

چار دن زندگی نبھالے گی　　　آخرش موت ہی سنبھالے گی

میر تقی میرؔ نے یہی مضمون باندھا ہے کہ اے تاج ورو! دیکھ لینا کل تمھارے سر سے تاج غائب ہوگا، بلکہ جسم سے بیش قیمت لباس کی جگہ سادہ سفید کفن پہنا دیا جائے گا۔ جواہرات لگے تخت کی بجائے کچی زمین کی ویران اندھی قبر میں تمھیں دھکیل دیا جائے گا۔ لوگ تمھارے بے جان جسد پر ماتم کریں گے، آہ وزاری کریں گے۔ اعزہ چلائیں گے، اقارب چیخیں گے اور احباب نوحہ کناں ہوں گے۔ لیکن یہ ماتمی رنگ بھی چند گھڑیوں کا ہوگا اور پھر کائنات کا نظام ویسے ہی رواں دواں ہوگا جیسا پہلے تھا۔ احباب اعزہ و اقارب تمھارا غم بھول جائیں گے۔ گویا کوئی حادثہ ہوا ہی نہ تھا۔ اور بس یہی نہیں بہت ممکن ہے کہ حوادثِ زمانہ تمھاری قبر کا نشاں بھی مٹا دے جیسا کہ اکثر ہوا ہے۔ بقول شاعر:

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا　　　مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے؟

میرؔ کے اس شعر کو ہم دورِ میرؔ سے بھی پرکھ سکتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا کہ جب برصغیر میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ خود لال قلعہ سازشوں کا گڑھ تھا۔ آئے روز کسی مغل شہزادے اور شہنشاہ کا مقتول جسم قبرستان کے سپرد ہوتا۔ غلام قادر روہیلا نے مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی کی آنکھوں میں دہکتی سلاخیں پھروادی تھیں۔ چناں چہ میرؔ ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

اے حبّ جاہ والو، جو آج تاج ور ہے　　　کل اس کو دیکھیو تم، نے تاج ہے، نہ سر ہے

جنگ آزادی 1857ء کے بعد کے حالات دیکھیے۔ میر کے اس شعر کے اک اک حرف کے مواقف یہ حالات تھے۔ آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کر کے مائمار (برما) بھیج دیا گیا اور شاہی خاندان کے ساتھ جو بیتی وہ ناقابلِ بیاں ہے۔ غدر کے بعد یہ لوگ خفیہ طور پر قلعے سے بھاگ نکلے لیکن حد تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں نے بھی ان کی مخبری کی۔ کئی کئی روز یہ بھوکے رہتے، لوگ انھیں بھیک بھی نہ دیتے۔ بقول میرؔ:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں　　　تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

الغرض انگریزوں نے خاندانِ مغلیہ کی بربادی میں کسر نہ چھوڑی، مغل شہزادے نیزے میں پرو کر لال قلعے کے صدر دروازے پر لٹکائے گئے۔ شاہی خاندان کے کئی افراد کو گھوڑوں کے ٹاپوں تلے روندا گیا۔ اس طرح مغلِ اعظم شہنشاہ جلال الدین اکبر جو کہتا تھا۔ "ہندوستان ایک مسکین کتے کی طرح میرے پاؤں کے تلوے چاٹ رہا ہے۔" "چشم فلک دیکھے گی کہ خاندانِ تیموریہ کو کبھی زوال نہیں"۔ کا نسلی غرور خاک میں مل گیا۔

شعر 2

اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا　　　آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت

(بہاول پور 09، ڈیرہ غازی خان 09,10 ملتان 06,08، سرگودھا 13)

حل لغت: آفاق: دنیا، کائنات　منزل: ٹھہرنے کی جگہ یا مقام　سلامت: محفوظ

اسباب: ساز و سامان سفری: مسافر

مفہوم: دنیامیں ہر مسافر کا اسباب راستے ہی میں لٹ جاتا ہے گویا کوئی بھی اس دنیا سے سلامت نہ جا سکا۔

تشریح:

تشریح طلب شعر میں میر تقی میر نے دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا تذکرہ کیا ہے۔انسانوں کوانھوں نے مسافر قرار دیا ہے اوراس دنیا کو ایک رہ گزر کہا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ یہ ایک ایسی رہ گزر ہے جہاں سے کوئی بھی مسافر سلامت نہ گزر سکا۔ایک ایک شخص کو اس دنیا نے تہی دست کر کے اپنی آغوش (قبر) میں لے لیا اور اس کا اسباب ہتھیالیا۔اور جوشخص بھی اس دنیا میں بطن مادر سے وارد ہوتا ہے تو اُس وقت معصوم اور گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔اُس کا قلبی آئینہ شفاف ہوتا ہے۔ارشادِ نبوی ﷺ ہے۔

كل مولود يولد على الفطره (الحديث) ترجمہ ہر بچہ فطرت سلیمہ لے کر پیدا ہوتا ہے

لیکن جوں ہی اس عالمِ رنگ و بو میں ہوش سنبھالتا ہے تو آلائشِ دنیاوی، آسائشیں اور خواہشات نفسانی اس کی معصومیت کو پاش پاش کرنے کے لیے تیار ہوتی ہیں۔ جب وہ اس دنیا کو خیر باد کہتا ہے تو اُس کا پیمانہ گناہوں سے لبریز ہوتا ہے گویا دنیا نے اُس کی معصومیت کو تہ تیغ کر دیا اور اُس کی معصومیت لوٹ لی۔

الغرض اس کائنات سے رخصت ہونے والوں کی اکثریت اپنے سر پر گناہوں کے گٹھڑ لاد کر چل پڑتی ہے۔بقولِ شاعر:

اس جہاں میں آ کے ہم کیا کر چلے بارِ عصیاں اپنے سر پر دھر چلے

چناں چہ جو انسان بھی دنیا میں آتا ہے وہ اپنے کاموں اور دھندوں میں مگن ہوتا ہے کہ موت آ کر اُس کا گلا دبوچ لیتی ہے، گویا اس دنیا کی تنگ پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے اُسے اس کی روح سے ہی محروم کر دیا جاتا ہے۔مختصراً یہ کہ اس کی متاعِ قیمتی یعنی جان ہی لوٹ لی جاتی ہے۔بقول شاعر:

موت سے کس کو رُست گاری ہے آج وہ، کل ہماری باری ہے

دراصل انسان اس دنیا میں یوں دل لگا لیتا ہے کہ گویا یہ دنیا اُس کا ابدی ٹھکانا ہے۔وہ یہاں بڑے بڑے محلات اور کوٹھیاں تعمیر کرتا ہے۔یہاں دولت کے انبار جمع کرتا ہے، کھربوں کا بنک بیلنس جمع کرتا ہے۔لیکن جب موت کا بے رحم ہاتھ اُس کے جسم سے روح کھینچ لیتا ہے تو اس کا یہ تمام سامان، مال و اسباب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے گویا اس نادان شخص کی کل جمع پونجی موت نے لوٹ لی۔

سکندرِ اعظم، دنیا کا فاتح تھا۔یورپ میں پیدا ہوا یورپ تسخیر کرتے ہوئے افریقہ پہنچا۔افریقہ کی تسخیر کے بعد ایشیا کا رُخ کیا۔دریائے بیاس کے کنارے اُس کی حالت غیر ہوگئی۔چناں چہ مرتے وقت یہ وصیت کرتا ہے کہ "مرنے کے بعد میرے ہاتھ کفن سے باہر نکال دینا، دنیا دیکھے کہ سکندر خالی ہاتھ چلا گیا"۔اُس کا تو بقول شاعر یہ حال تھا۔

جائے گا جب یہاں سے کچھ بھی نہ پاس ہوگا دو گز کفن کا ٹکڑا تیرا لباس ہوگا

شعر 3

ہر زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

(بہاول پور 09، ڈیرہ غازی خاں 09،10، ملتان 08،06، لاہور 06، گوجرانوالہ 06، سرگودھا 2013ء)

حل لغت: داور: منصف، انصاف کرنے والا محشر: قیامت انصاف طلب: انصاف چاہنے والا

بیدادگری: ظلم، جفا، ناانصافی

مفہوم: اے محبوب ہمارے قلب وجگر پر لگا ہوا ہر زخم روزِ قیامت اللہ تعالیٰ سے تیرے ظلم وستم کے خلاف انصاف مانگے گا۔

تشریح:

ہماری اردو کی روایتی اور کلاسیکی شاعری میں عاشق مظلومیت کا پیکر بن کر سامنے آیا ہے۔ جب کہ محبوب ظلم وستم کے پہاڑ توڑتا دکھائی دیتا ہے۔ عاشق مظلوم، سوختہ جاں اور آتشیں دل کا حامل اور ایک ایسا پیکر دکھائی دیتا ہے جس پر ہر طرف سے نشتر زنی ہوتی ہے۔ محبوب کی بے رُخی الگ، لوگوں کی طعنہ زنی الگ، احباب کی بے دادرسی الگ اور رقیب کی رقابت الگ، اُس کے دل وجگر کو زخمی کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف محبوب ہے کہ جو کسی صورت میں بھی عاشق کے جذبات کا احترام نہیں کرتا۔ گو عاشق اُس سے ہزار وفاداریاں جتلاتا ہے اور اکثر ان وفاداریوں کا تجرباتی ثبوت بھی فراہم کرتا ہے لیکن محبوب ہے کہ کسی صورت عاشق کا ہم نوا نہیں بنتا۔ راہ عشق میں عاشق کو اس قدر مصائب پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ بقول جگر مرادآبادی:

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

ان تمام مشکلات اور مصائب کے باوصف جن سے ایک عاشق صادق کو پالا پڑتا ہے، وہ ان تمام مصائب کو صبر اور خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ آخر ایک دن محبوب اُس سے خندہ پیشانی سے پیش آئے گا اور یہ سوچتے ہوئے کہ مصائب کا سامنا ہے تو کیا راہِ عشق ہمیشہ سے ہی پرخار رہی ہے اور عشق کے راستے پر جگہ جگہ آگ کے الاؤ انسان کا استقبال کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اس منزل کے راہی کو خون کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ یہی تو ہے عشق۔ بقول شاعر:

زخم پہ زخم کھا کے جی، اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر، لبوں کو سی، یہ عشق ہے دل لگی نہیں

لیکن ان تمام پریشانیوں کے باوجود عاشق صبر کرتا ہے۔ وہ محبوب سے اُس کے جور وستم کی بہت کم شکایت کرتا ہے۔ میر تقی میرؔ نے یہی کیفیت شعر میں قلم بند کی ہے کہ اے محبوب میں نے تمھارے سب نشتر دل پہ خندہ پیشانی سے سہے، اک اک ظلم ہنس کر برداشت کیا اور آئندہ بھی برداشت کروں گا۔ لیکن عنقریب چار دن کی فانی زندگی کے بعد عدالت قائم ہونے والی ہے۔ جس کا منصف خود اللہ تعالیٰ ہوگا۔ یہ ایسا دن ہوگا کہ جب ہر ذی روح کو انصاف ملے گا انسان کے اپنے کرتوتوں اور دوسرے کے مظالم کے خلاف زبان تو کجا ہاتھ پاؤں اور اعضا شہادت دیں گے۔ چناں چہ میر کہتے ہیں کہ اے محبوب، دنیا میں، میں نے تیرے خلاف شکوہ نہیں کیا لیکن روز حشر میرا اک اک عضو، میرا اک اک زخم تمھارے مظالم کے خلاف فریاد کرے گا۔ اگرچہ میں اس روز بھی چپ رہوں گا لیکن اعضا تو تمھارے خلاف بولیں گے۔ بقول شاعر:

باز آجاؤ ظلم سے ہمدم
ورنہ اِک روز حشر کا بھی ہے

دراصل میر نے محبوب کو اس خوب صورت انداز میں وفاداری کی نصیحت کی ہے کہ نہ تو یہ شکایت کے زمرے میں آئے نہ عاشق کی بے صبری میں، بلکہ خود محبوب کے فائدے میں شمار ہو۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں کہ اے محبوب اپنے رویے پر نظرثانی کرو، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے ورنہ روز حشر تمھیں حساب دینا ہوگا جو بڑا ہی کٹھن ہے۔ بقول شاعر:

بہتر ہے ظلم چھوڑ کے بن جاؤ تم رفیق
رکھو نہ تم جفا کے طریقے سنبھال کے

شعر 4

آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

(ملتان 06، لاہور 06 گوجرانوالہ 06، سرگودھا 2013ء)

حل لغت: آفاق: افق کی جمع، کائنات/ دنیا　　کار گہہ: کارخانہ　　شیشہ گری: شیشہ سازی

مفہوم: یہ دنیا شیشہ سازی کے کارخانے کی مانند ہے لہٰذا انسان کو چاہیے کہ نہایت احتیاط سے اس دنیا میں زندگی بسر کرے۔

تشریح:

تشریح طلب شعر میں میر تقی میر نے اس دنیا کو ایک ایسے کارخانے سے تشبیہہ دی ہے جس میں شیشہ سازی کی جاتی ہو۔ یاد رہے کہ شیشہ ایک ''امارفس سالڈ'' ہے اور ان سالڈز کی تخلیق بہت محتاط اور نازک عمل ہوتا ہے۔ ''مولٹن گلاس میٹریل'' یعنی پگھلے ہوئے شیشے کے مادے کو آہستہ آہستہ ٹھنڈا کرتے ہوئے اور احتیاط سے ہلاتے ہوئے شیشے میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ بے احتیاطی اور تیز ٹھنڈک شیشے کو بری طرح بنا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ شیشہ سازی کے کارخانے میں کارکنوں اور مزدوروں وغیرہ کو بھی نہایت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اُن کی بے احتیاطی سے شیشہ ٹوٹنے کے علاوہ خود اُن کے اپنے زخمی ہونے کے بھی امکانات ہوتے ہیں۔ گویا اس کارخانے میں معمولی سی بے احتیاطی دوہرے نقصان کو جنم دے سکتی ہے۔ بقول شاعر:

ٹوٹ جائے تو پھر نہیں جڑتا
یہ صفت آئینے میں دیکھی ہے

تشریح طلب شعر میں بھی میر انسان سے مخاطب ہیں کہ تمھیں یہاں نہایت احتیاط سے رہنا چاہیے کیوں کہ یہ دنیا بالکل شیشہ سازی کے کارخانے کی مانند ہے کہ:

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگہہ ساری دکان شیشہ گر ہے

کائنات میں لامحدود انواع حیات ہیں۔ لیکن شاعر نے صرف بنی آدم ہی کو محتاط رہنے کی تنبیہہ کی ہے۔ انسان اشرف المخلوقات اور اللہ تعالیٰ کا نائب ہے۔ بروز قیامت صرف انسان ہی اپنے اعمال کا جواب دہ ہوگا۔ کیوں کہ عالم ارواح میں انسان نے جواب دہی کی ذمہ داری لی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن پاک کی سورۃ احزاب میں اشارہ کیا گیا۔ ارشاد ربانی ہے۔ "ہم نے اس امانت کو آسمانوں، زمین اور کائنات کے سامنے پیش کیا تو وہ اُسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے۔ مگر انسان نے اسے اٹھا لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے''۔ بقول میر تقی میر:

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

یہی جواب دہی کا بار تھا جسے اُٹھانے سے تمام انواع حیات نے انکار کر دیا اور ناداں انسان نے اسے قبول کر لیا۔ چنانچہ میر تقی میر کہتے ہیں کہ انسان کو شدید احتیاط کی ضرورت ہے کیوں کہ اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔ سورۃ العدیٰت میں اللہ نے فرمایا کہ: ''ذرہ بھر برائی اور ایک ذرہ اچھائی (نیکی) کا حساب ہوگا''

اس لیے انسان کو چاہیے کہ ایک ہلکا سا عمل اور چھوٹا سا قدم بھی سوچ بچار کر کے اٹھائے اور خدا کی رضا کے مطابق اٹھائے تا کہ روز قیامت خدا کے سامنے سرخرو ہو سکے۔

مندرجہ بالا تشریح طلب شعر میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اس دنیا میں تمام انسان ایک دوسرے سے کسی نہ کسی رشتے سے باہم منسلک ہیں اور تمام پر ایک دوسرے کے حقوق و فرائض ہیں، جو کہ حقوق العباد کہلاتے ہیں۔ مزید برآں انسان کو نازک مزاج

لوگوں کے جذبات کا بھی احترام کرنا چاہیے۔ وگرنہ شیشہ سازی کی طرح ذرہ برابر بے احتیاطی سے دہرا نقصان ہوگا۔ ایک تو انسان کو بروزِ قیامت جواب دہ ہونا ہوگا اور دوسرا ان لوگوں کے جذبات مجروح ہوں گے اور قلوب چکنا چور ہو جائیں گے۔ لہٰذا بقول میر انیس:

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم ؎ انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

شعر 5

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے ۔ کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

حل لغت:

ٹک: ذرا، ایک لمحہ، کچھ

جگر سوختہ: جلا ہوا دل ۔ چراغِ سحری: صبح کے وقت کا چراغ، ایسا چراغ جو بجھنے کے قریب ہو

مفہوم:

اے محبوب دکھوں اور مصائب کے مارے ہوئے میر کی جلد خبر لو کیوں کہ چراغِ سحری کی مانند اب چراغِ حیاتِ میر بھی بجھنے کے قریب ہے۔

تشریح:

یہ مقطع کا شعر ہے۔ میر نے اپنے محبوب کی غفلت شعاری اور لاپروائی کا مضمون باندھا ہے۔ اور اپنی ذات پر آنے والے غموں کے انبار کا تذکرہ کیا ہے۔ اپنے محبوب کے عشق میں ایک سچے عاشق کو ان گنت مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

چناں چہ میر تقی میر کہتے ہیں کہ محبوب کے تیرِ ستم سہہ کر اُس کا دل پاش پاش ہو چکا ہے۔ محبوب کی ستم شعاریوں نے گویا اُس کے دل میں آگ لگا دی ہے۔ بقول خواجہ میر درد:

تیرے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا ؎ اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں

روایتی طور پر محبوب ظالم واقع ہوا ہے۔ عاشق اُس کے فراق میں تڑپتا ہے۔ لیکن محبوب وفا شعار عاشق کو اپنی جھلک تک نہیں دکھاتا۔ تمام زندگی عاشق اپنے محبوب کے دیدار کی تمنا دل میں لیے رکھتا ہے۔ محبوب کی اس بے وفائی سے عاشق ناتواں ہو جاتا ہے چناں چہ میر نے خود پیش گوئی کی ہے کہ اب اُن کی زندگی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھنے کے قریب ہے۔

لہٰذا شاعر محبوب سے التجا کرتا ہے کہ وقتِ آخر تو میری عیادت کر لو تا کہ حالتِ نزع میں تمھارا دیدار نصیب ہو سکے۔ کیوں کہ جلد ہی میری آنکھیں بے نور ہونے والی ہیں کہ: بقول شاعر:

آ، آخری دیدار کرانے کے لیے آ ؎ ہے مرگ کے بستر پہ ترا منتظر انجم

اور بقول کرامت دنیا پوری:

دھوکہ نہ دے، یہ زندگی ناپائیدار ہے ؎ اِس چشمِ تر سے آج میں جی بھر کے دیکھ لوں

غزل (2)

شعر 1

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش	رہتی اک آدھ دن بہار اے کاش

(بہاول پور 10،07، ڈی جی خان 08، لاہور 11، ملتان بورڈ 13ء)

حلِ لغت: گل: گلاب کا پھول	صبا: صبح کے وقت چلنے والی ہوا	قرار: سکون، ٹھہراؤ	ثبات: قیام، دوام

مفہوم: اے بادِ صبا! کاش گل کو ثبات ہوتا، تا کہ ایک آدھ دن بہار اور رہ سکتی۔

تشریح:

پہلے ادوار میں یہ نظریہ عام تھا کہ گلوں کو کھلانے کا سبب ہوا ہے اور کہا جاتا تھا کہ شبنم کے گرنے سے پھولوں کے بند شگوفوں کے منہ نرم پڑ جاتے ہیں۔ صبح کے وقت چلنے والے خوش گوار ہوا کے جھونکوں کی مدد سے یہ پھول کھلتے ہیں۔ گویا پھولوں کے کھلنے کا باعث بادِ نسیم ہے۔ تاہم عصرِ حاضر کی تحقیق نے اس نظریے کو رد کیا ہے کیوں کہ شبنم نہ بھی پڑے یا ہوا نہ بھی چلے تو پھول پھر بھی کھلتے ہیں۔ اس جدید نظریے کے مطابق دی ٹرگر، پریشر آف واٹر اور واٹر جیڈینٹ یعنی پانی کا تناؤ اور سورج کی روشنی جیسے عوامل براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے پھول کھلتے ہیں۔

میر تقی میر نے تشریح طلب شعر میں پہلے نظریے کا پرچار کیا ہے اور پھول کی مختصر اور عارضی زندگی کا مضمون باندھا ہے۔ شاعر بادِ صبا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے صبا تو جو یہ پھول کھلا رہی ہے۔ انھیں دو چار دن کی زندگی بھی عطا کر جب کہ گلوں کی زندگی نہایت ہی قلیل ہوتی ہے۔ بقول میر تقی میر:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات	کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

شاعر کی خواہش ہے کہ کاش پھولوں کی زندگی میں اضافہ ہو جائے کیوں کہ چمن میں پھول کھلنے سے ہر سو بہار کا موسم چھا جاتا ہے اور پورا باغ معطر و حسین ہو جاتا ہے۔ باغ کے تمام مناظر جوبن پر ہوتے ہیں۔ چرند پرند اور انسان تمام اس موسم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن جوں ہی ننھی کلیوں اور رنگ برنگے پھولوں کا خون ہوتا ہے، تو چمن سے گویا خوشیوں کا بھی جنازہ نکل جاتا ہے۔ باغ بے رونق ہو جاتا ہے نہ پرندے ادھر کا رُخ کرتے ہیں نہ انسان ادھر ٹہلتے ہیں گویا باغ کی تمام رونقوں کو پھول ہی کے دم سے ثبات ہے۔ فی الحقیقت کائنات کی تمام حسین اشیا (ماسوائے اللہ تعالیٰ) کی حیات نہایت ہی قلیل ہوتی ہے۔ گل، چاند تارے اور جوانی الغرض ہر شے کو زوال ہے۔

موسمِ بہار انسانی زندگی میں خوشی اور مسرت کا اظہار بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح پھول کی زندگی نہایت قلیل ہے اسی طرح انسانی زندگی میں مسرتوں کا دورانیہ بھی بڑا مختصر ہوتا ہے اور مصائب کا سلسلہ طویل محسوس ہوتا ہے۔ بقول شاعر:

چند کلیاں نشاط کی چن کر	مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی	تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

اس شعر میں انسانی زندگی کی ناپائیداری کا ذکر بھی ہے کہ دنیا کی زندگی فقط چار روزہ ہے۔ انسان کو ابھی اس دنیا میں آئے دو روز ہی ہوتے ہیں کہ موت آ کر اُس کا گلا دبوچ لیتی ہے۔ گویا یہ دنیا بالکل ناپائیدار ہے جس میں بہار یعنی خوشیوں کا زمانہ بہت قلیل ہے۔ بقول بہادر شاہ ظفر:

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں	کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

شعر 2

یہ جو دو آنکھیں، مندگئیں میری اس پہ وا ہوتیں، ایک بار اے کاش

(بہاول پور 2007،10، ڈی جی خان 2000،08، لاہور بورڈ 2011، ملتان بورڈ 13،)

حل لغت: مند جانا: بند ہونا، موت آجانا وا ہونا: کھلنا کاش: کلمہ حسرت یا افسوس

مفہوم: کاش میری دو آنکھیں جنھیں موت نے بند کر دیا ہے، کھل سکتیں تا کہ میں محبوب کا دیدار کر سکتا۔

تشریح:

عشق کی راہ پر چلنے والے کو جگہ جگہ پُر خار حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ ان تمام مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔ لیکن عاشق کے لیے محبوب کا یہ ستم نا قابلِ برداشت ہوتا ہے کہ محبوب اُسے اپنے دیدار سے محروم رکھے۔ وہ بار بار محبوب سے اپنے حالِ زار کے متعلق فریاد کرتا ہے اور جامِ دیدار طلب کرتا ہے۔ لیکن عاشق کی یہ خواہش اکثر اوقات پوری نہیں ہوتی۔ محبوب کے دیدار کی آرزو رفتہ رفتہ حسرت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور عاشق محبوب کے دیدار سے نا امید ہونے لگتا ہے۔ عاشق محبوب کی بے وفائیوں کے صدمات اُٹھا کر قریب المرگ ہو جاتا ہے لیکن محبوب پر اس کی اس حالت کا اثر بالکل بھی نہیں ہوتا۔ عاشق اُس سے التجا کرتا ہے کہ حالتِ نزع میں تو دیدار کرا دے کیوں کہ اب وہ وہاں جا رہا ہے جہاں سے آج تک کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔ بقول علاؤالدین کلیم:

کون لوٹا اجل کی راہوں سے پھر کسے فرصتِ نظر ہوگی
شرمگیں شرمگیں نگاہوں سے آخری بار دیکھ لو مجھ کو

لیکن محبوب حیلے بہانے سے کام لیتا ہے اور اُسے اس بات کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ کوئی دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ رہا ہے۔ بقول یعقوب انجم:

کیا زمانے کو منہ دکھاؤ گے میرے مرنے کے بعد آؤ گے

چناں چہ عاشق انتظار کرتے کرتے تھک جاتا ہے لیکن محبوب نہیں آتا البتہ ملک الموت ضرور آجاتا ہے۔ تاہم شاعر دیدارِ محبوب کا اس قدر متمنی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ جب اُس کی موت کا سن کر محبوب اُس کی لاش پر آئے تو اس کی آنکھیں کھل جائیں تا کہ وہ محبوب کی ایک جھلک تو دیکھ سکے۔ بقول شاعر:

زندگی لوٹ کر نہیں آتی آبھی جاؤ کہ وقت نازک ہے

یاد رہے کہ موت کے بعد انسان دیکھنے اور سننے کی صلاحیت رکھتا ہے صرف جسم کی حرکت اور زبان کی حرکت (بولنے کی طاقت) اُس سے چھین لی جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میر نے موت کے بعد بھی دیدار کی تمنا کی ہے۔ یہ شاعر کے سچے عاشق کی نشانی ہے گویا بعد موت بھی شاعر کی آنکھیں محبوب کے دیدار کی متلاشی رہیں گی تا کہ شاعر کا بے جان جسم اس سے تسکین پا سکے۔

(3)

کن نے اپنی مصیبتیں نہ گنیں رکھتے میرے بھی غم شمار اے کاش

(بہاول پور 07،10، ڈیرہ غازی خاں، ملتان 08 لاہور 2011، ملتان بورڈ 2013،)

حل لغت: کن نے: کس نے شمار کرنا: گننا، حساب کتاب کرنا

مفہوم: ہر شخص نے اپنی مصیبتیں گنیں، کاش یہ لوگ میرے غموں پر بھی نظر ڈالتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ میں سب سے زیادہ غم زدہ ہوں۔

تشریح:

یہ دنیا مصائب کا گھر ہے۔ ہر شخص کا دل دکھوں کی آماجگاہ ہے۔ زندگی پریشانیوں سے عبارت ہے۔ ہر انسان کو کوئی نہ کوئی غم لاحق ہے۔ انسانی دماغ کسی نہ کسی پریشانی میں گھرا ہی رہتا ہے۔ یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہر انسان کو دکھوں سے ضرور واسطہ پڑتا ہے، یہ الگ بات ہے کوئی ان مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے اور کوئی ہنگامہ برپا کر دیتا ہے اور شکوہ جور و جفا شروع کر دیتا ہے۔ دراصل میر تقی میر نے یہاں غموں کا شکوہ کیا ہے۔ یاد رہے کہ میر تقی میر بعض کے نزدیک قنوطیت پسند شاعر تھے۔ وہ جا بجا اپنے اشعار میں شکوہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تشریح طلب شعر میں بھی وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے ہی مصائب دوسروں کے سامنے بیان کرتا رہتا ہے۔ لیکن دوسروں سے اُس کے غموں کی نوعیت نہیں پوچھتا۔

بقول ناصر کاظمی:

ہر کوئی اپنے غم میں ہے مصروف
کس کو درد آشنا کہے کوئی

ہر انسان یہ سمجھتا ہے کہ صرف وہی غم زدہ ہے باقی ساری مخلوق خوش نصیب ہے، جو کہ اس کی غلط فہمی ہوتی ہے۔ شاعر کے سامنے بھی اس کے احباب اپنے ہی غموں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ چناں چہ یہ تمنائی لہجے میں کہتے ہیں کہ اے کاش! یہ لوگ میرے غموں اور دکھوں سے آگاہ ہوتے تو انھیں اپنے غم حقیر دکھائی دیتے اور یہ لوگ اپنے دکھ بھول جاتے کیوں کہ میرے غم بہت زیادہ ہیں۔ ایک اور جگہ میر نے یہی مضمون یوں باندھا ہے کہ۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میر کے اس شعر کی ایک اور انداز سے بھی تشریح کی جا سکتی ہے۔ میر کہتے ہیں کہ تمام لوگ جو میرے سامنے اپنے دکھڑے بیان کرتے ہیں۔ وہ گن گن کر بیان کرتے ہیں یا پھر ان کے غم ہی اتنے تھوڑے ہوتے ہیں کہ وہ گنے جا سکتے ہیں۔ جن غموں اور دکھوں سے انھیں پالا پڑا ہوتا ہے وہ با آسانی گنے جا سکتے ہیں۔ چناں چہ شاعر ان کے غموں کا احاطہ گنتی میں کرنے کی حالت کو دیکھ کر حسرت آمیز لہجے میں کہتا ہے کہ کاش میرے بھی غم قابلِ گنتی ہوتے، میرے بھی غم گنے جا سکتے۔ دوسرے الفاظ میں شاعر کہتا ہے کہ جن تکالیف اور مصائب سے میرا سامنا ہوا ہے، وہ بہت زیادہ ہیں کیوں کہ میں نے اتنے غم اور دکھ سہے ہیں جو گنے نہیں جا سکتے۔ اگر لوگ میرے غموں پر توجہ دیتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ ان کی نسبت میرے غم کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن افسوس کسی نے ان دکھوں کی نسبت پوچھا ہی نہیں۔ گویا:

میں نے اپنا حالِ دل چاہا، کہوں جس پاس عالم میں
بیان کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی تباہی کا

ویسے بھی میر کو بہت زیادہ دکھوں کا سامنا ہوا۔ نجی زندگی کے دکھ، ذاتی دکھ، رشتے داروں کے عطا کردہ دکھ، محبوب کے دیے گئے دکھ، زمانے کے دکھ، بلکہ ہر طرف سے انھیں دکھوں سے واسطہ پڑا۔

آ مجھے دیکھ، جسے دیکھ کے دنیا کہہ دے
ہم نے پھرتا ہوا، بازار میں غم دیکھا ہے

شعر 4

جان آخر تو جانے والی تھی
اس پہ کی ہوتی میں نثار اے کاش

(ملتان 2008ء)

حل لغت:

نثار: قربان

مفہوم:

میری جان تو آخر ایک روز جانی ہی تھی کاش اسے محبوب پر نچھاور کر دیتا۔

تشریح:

زیرِ تشریح شعر میں شاعر نے اپنی جان محبوب پر قربان کرنے کی تمنا کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میری یہ جان تو فانی تھی اور آخر اک روز فنا ہونی تھی۔ تو پھر کیوں نہ اسے محبوب کے قدموں میں نچھاور کر دیتا۔ دراصل عشق کی راہ بڑی کٹھن ہے، قدم قدم پر انسان کو مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جہاں انسان کا سب کچھ لٹ جاتا ہے۔ سکون، راحت، آرام و چین سب کچھ چھن جاتا ہے اور ان کے عوض غم حاصل ہوتے ہیں۔ عاشق کو چاہیے کہ تمام دکھ صبر سے برداشت کرے کیوں کہ عشق کے معاملات میں اس طرح کے حالات معمول کی بات ہے یہاں لہو کے گھونٹ پی کر جینا پڑتا ہے۔ بقول جاوید انجم لائل پوری:

قدم قدم پر مصیبتیں ہیں ہزار غم ہیں، ہزار کانٹے
کٹھن سفر ہے محبتوں کا یہ راہ مت اختیار کرنا

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس عشق کی خاطر انسان کو اپنی قیمتی چیزیں قربان کرنا پڑتی ہیں اور اکثر اوقات جان بھی قربان کرنا پڑتی ہے۔ دین و دل جان و ایمان سب کچھ محبوب کی نذر ہو جاتا ہے۔ بقول اختر شیرانی:

ایمان و جاں نثار تری اک نگاہ پر
تو جان آرزو ہے، تو ایمان آرزو

میر کہتے ہیں کہ میں نے بھی محبوب سے دل لگانے کے بعد اس کی خاطر زمانے بھر کی اذیتیں، مصیبتیں، تہمتیں، ملامتیں اور رسوائیاں برداشت کیں۔ میں نے محبوب کی خوشی کی خاطر طرح طرح غم و آلام اور دکھ سہے، اس کی قربت کی خاطر تمام مصیبتوں کو گلے لگایا۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ میرے دل میں یہ خیال نہ آیا کہ میں اپنی جان بھی اپنے محبوب پر قربان کر کے حق محبت ادا کر دوں۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں کہ میری جان تو آخر اک روز چلی ہی جانی تھی۔ روح اور جسم کا تعلق اک روز ختم ہو جانا تھا، زندگی کی مختصر ڈور اچانک منقطع ہو جانی تھی لہٰذا اس طرح خاموش موت مرنے سے کہیں بہتر تھا کہ یہ جان محبوب پر نچھاور کر دیتا تو میری وفا کا تقاضا پورا ہو جاتا۔ میں محبت میں ناکامی کے باوجود محبوب کی نظر میں سرخرو ہو جاتا۔ بقول غالب:

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

تاہم اس شعر کو حقیقی اور داخلی مفہوم کے اعتبار سے بھی پرکھا جا سکتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر شے فانی ہے اور ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ میری یہ جان بھی چند روزہ اور فانی تھی۔ میری یہ زندگی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ تھی، وہ مجھے عدم سے عالم وجود میں لے کر آیا۔ اسی اللہ نے مجھے ایک روز اس عالمِ فانی سے واپس بلا لینا تھا۔ میرے جسم کو جان اللہ نے عطا کی تھی اور زندگی کے دن پورے ہونے پر یہ جان جسم سے نکال لینی تھی۔ اس لیے بہتر ہوتا کہ فانی دنیا کے حسن پر فریفتہ ہونے کی بجائے اللہ تعالیٰ سے لو لگاتا اور اس کے احکامات کی بجا آوری کرتے ہوئے اس کی راہ میں جان قربان کر دیتا اور شہادت کا رتبہ پاتا۔ چوں کہ ایک شہید کو دونوں جہانوں میں کامیابی اور سرخروئی نصیب ہوتی ہے۔

لہٰذا ایک شخص کو چاہیے کہ اپنے خالق حقیقی کی راہ میں تن، من اور دھن کی بازی لگا دے تاکہ اس کی عاقبت بھی سنور سکے اور اس کی موت بھی پُرحسرت نہ ہو۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں جان دے کر بھی اس کا حق ادا نہیں کر سکتا کیوں کہ جان اللہ ہی کی دی ہوئی ہے اس لیے اس پر قربان کر دی جائے کیوں کہ کسی کی لی ہوئی شے آخر اسے واپس کرنی ہوتی ہے۔ غالب نے کہا ہے:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

شعر 5

اس میں راہِ سخن نکلتی تھی
شعر ہوتا ترا اشعار اے کاش

(ملتان 2008، ڈیرہ غازی خان 2006)

حل لغت: راہِ سخن نکلنا: گفتگو کا بہانہ پیدا ہونا شعار: طریقہ / عادت

مفہوم: اے محبوب! کاش تو بھی شاعر ہوتا، اس طرح ہمارے درمیان گفتگو کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔

تشریح: زیرِ تشریح شعر میں شاعر نے ایک اور حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ دنیا کی ساری رونق اور رنگینی جذبات ہی کے دم سے قائم ہے اور انسانی معاشرت جذبات و خیالات ہی کے ستونوں پر قائم ہے۔ اگر دنیا سے یہ جذبات ختم ہو جائیں تو عالم بے رنگ ہو جائے گا۔ انھی جذبات واحساسات کو لفظوں کا لباس پہنا کر مختصر مگر جامع سطور میں سمو دینے سے ہی اشعار تخلیق پاتے ہیں اور جذبات کو الفاظ میں ڈھالنے کا فن جاننے والے کو شاعر کہا جاتا ہے۔ شاعری فی الحقیقت احساسات وجذبات ہی کا نام ہے جیسا کہ بقول شاعر:

اظہارِ دردِ دل کا تھا اک نام شاعری
یارانِ بے خبر نے اسے فن بنا دیا

اشعار کی یہ افادیت ہے کہ ان کے پردے میں ایک شخص اپنے جذبات واحساسات کی کامیاب ترجمانی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام نثری تحریروں کی نسبت شعری تحریریں بہت زیادہ مؤثر ہوتی ہیں۔ باہمی گفتگو اور جذبات واحساسات کی ترجمانی کے لیے اشعار بہترین ذریعہ ہیں۔ تاہم اس کے لیے لازمی ہے کہ گفتگو کرنے والے دونوں سخن فہم ہوں۔ جیسے ہیرے کو کوئی جوہری ہی پہچان سکتا ہے۔ اسی طرح شعر کو بھی کوئی سخن فہم ہی پہچان سکتا ہے۔ ورنہ ایک ایسے شخص کے سامنے اشعار پڑھنا جو اشعار کی زبان سمجھنے سے قاصر ہو، بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔ میر کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ میر تو اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں۔ لیکن اُن کی شاعرانہ گفتگو محبوب کی سمجھ میں نہیں آتی۔ محبوب اُن کی بات نہیں سمجھ سکتا۔ لہٰذا میر حسرت آمیز لہجے میں کہتے ہیں کہ اے محبوب اگر تم بھی شاعر اور سخن فہم ہوتے تو کیا خوب ہوتا اور ہم بہتر طور سے گفتگو کر سکتے لیکن ایسا نہیں ہے۔ بقول احمد فراز:

ستم تو یہ ہے کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ ایک شخص جو شاعر بنا گیا مجھ کو

وجہ یہ ہے کہ شاعری میں اکثر اوقات استعارات، تشبیہات اور صنائع کے پردوں میں بات کی جاتی ہے اور ایسے انداز سے بات کی جاتی ہے جس کے کئی مفہوم ہوتے ہیں یعنی اشاروں اور کنایوں میں مدعا بیان کیا جا سکتا ہے۔ اگر محبوب سخن شناس ہوگا تو وہ شاعر کا مدعا سمجھ جائے گا ورنہ اس کے لیے شعر بے معنی ہوگا۔

اشعار میں ایسی باتیں بھی کہی جا سکتی ہیں جو عاشق و محبوب تک محدود ہوں اور شاعر ان سے کسی دوسرے کو واقف نہ کرانا چاہتا ہو۔ اسی خاصیت شعر کا کسی شاعر نے یوں اظہار کیا ہے:

اشعار کے پردے میں ہم جن سے مخاطب ہیں
وہ جان گئے ہوں گے کیوں نام لیا جائے

چناں چہ میر تقی میر کہتے ہیں کہ کیا ہی خوب ہوتا کہ اے محبوب تو شاعر ہوتا۔ اس طرح شاعری ہمارے مابین محبت و قربت کا ذریعہ بن جاتی میں اشعار کے پردے میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتا اور کبھی تو اشعار کے ذریعے اپنے دلی جذبات پیش کرتا۔ اس طرح ہمیں ایک دوسرے تک اپنے دلی جذبات واحساسات پہنچانے کا بھرپور موقع میسر آتا اور اشعار کے ذریعے ہم ایک دوسرے کے جذبات و کیفیات سے لحظہ بہ لحظہ آگاہ اور بخوبی واقف رہتے۔ اس طرح دونوں کے ذوقِ سخن کی قدرِ مشترک ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر رکھتی۔ کیوں کہ بقول فراق گورکھ پوری:

فراق اے کاش! سننے والوں کے سینے میں دل ہوتا
حقیقت ہوتی ہے اشعار میں باتیں نہیں ہوتیں

شاعر نے محبوب کے سخن شناس نہ ہونے پر اظہارِ تاسف کیا ہے۔

شعر 6

شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر
اس سے ہوتے نہ ہم دوچار اے کاش (ڈی جی خاں 2006)

حل لغت: شش جہت: چھ اطراف، اوپر نیچے، دائیں بائیں، آگے پیچھے یعنی تمام عالم تنگ ہونا: جائے پناہ نہ ملنا

دوچار ہونا: واسطہ پڑنا

مفہوم: کاش ہمارا محبوب سے واسطہ نہ پڑتا کیوں کہ اُس کی وجہ سے آج ہمیں دنیا میں کہیں پناہ نہیں مل رہی۔

تشریح: زیرِ تشریح شعر میں شاعر نے محبوب سے عشق کرنے کے بعد پیش آنے والے غم و آلام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ آسان کام نہیں ہوتا بلکہ نہایت کٹھن اور پر خطر ہوتا ہے۔ اس میں عاشقوں کو سینکڑوں مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ محبوب کی طرف سے ملے ہوئے غموں اور دکھوں کے ساتھ ساتھ سارا زمانہ عاشق کا دشمن بن جاتا ہے۔ اپنے، پرائے، رشتہ دار، احباب اور سبھی عاشق پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ جگہ جگہ عاشق کے پاؤں چھلنی ہوتے ہیں۔ اذیتوں، مصیبتوں، ملامتوں اور بلاؤں سے اس کا پالا پڑتا ہے۔ بقول خواجہ میر درد:

ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا — اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں

زندگی و موت دونوں دشوار ہو جاتے ہیں۔ جگر مراد آبادی کہتے ہیں۔

ابتدا وہ تھی کہ تھا جینا محبت میں محال — انتہا یہ ہے کہ اب مرنا بھی مشکل ہو گیا

راہِ عشق میں عاشق کو عموماً دوہرے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اولیں تو اُسے محبوب کے نت نئے مطالبات پورے کرنے پڑتے ہیں اور بے وفا محبوب کے مطالبات کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' کے مصداق وفا شعار عاشق پر لوگ طعنہ زنی کرتے ہیں اور اُس کے جذبات کو مجروح کرتے ہوئے الٹا اُس کی مذمت کی جاتی ہے اور پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ عاشق جہاں بھی جاتا ہے لوگ اُسے طعنے دیتے ہیں اور اُس کا جینا محال کر دیا جاتا ہے۔ اغیار ہوں کہ رشتہ دار دونوں اُس کی جاں کے درپے ہوتے ہیں اور عاشق جہاں بھی جاتا ہے اسے ذلتوں اور رسوائیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ بقول شاعر:

جس سمت بھی جاتا ہوں کہتے ہیں کہ وہ آیا — ہے چار قدم آگے مجھ سے میری رسوائی

میر کے ساتھ بھی یہی بیتی ہے۔ میر کہتے ہیں کہ محبوب سے ملاقات سے قبل ہماری زندگی میں اتنے غم نہ تھے۔ لوگوں کے طعن و تشنیع کا سامنا نہ تھا لیکن محبوب سے ملاقات کے بعد تو تمام عالم ہی ہمارے خلاف ہو گیا ہے۔ گھر بار، سکون و چین ہر شے برباد ہو گئی۔ محبوب تو ویسے ہی بے وفا تھا اور سونے پر سہاگہ یہ کہ دنیا بھی ہم سے کنارہ کش ہو چکی ہے۔ ہم پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان حالات سے تنگ اور بے زار ہو کر میر حسرت آمیز لہجے میں کہتے ہیں کہ کاش ہمارا محبوب سے واسطہ نہ پڑتا۔ کاش ہمارا محبوب سے سامنا نہ ہوتا۔ نہ ہمارا محبوب سے سابقہ پڑتا اور نہ ہمیں بے پناہ مشکلات و مصائب میں مبتلا ہونا پڑتا۔ یوں لگتا ہے جیسے ساری دنیا ہی ہماری دشمن بن گئی ہے اور وسیع و عریض کائنات میں ہمیں کوئی مقامِ عافیت نظر نہیں آتا۔ بقول میر تقی میر:

دشمنی ہم سے کی زمانے نے — کہ جفا کار تجھ سا یار کیا

کائنات میں اگر کوئی ہمارے لیے گوشۂ عافیت تھا تو وہ درِ محبوب ہی تھا مگر وہاں تک رسائی حاصل کرنا ہماری قسمت میں نہ تھا۔ اب ستم یہ ہے کہ ایک طرف محبوب سے محبت کا دعویٰ کرنے اور مصائب و دکھ برداشت کرنے کے باوجود ہم محبوب کی قربت سے محروم رہے۔ دوسری طرف محبوب سے محبت کا دعویٰ کرنے کی وجہ سے سارا زمانہ ہی ہماری دشمنی کے درپے ہے۔ اس طرح ساری کائنات ہمارے لیے تنگ ہو گئی ہے۔ چناں چہ ہم جس سمت بھی جاتے ہیں کوئی جائے پناہ نہیں ملتی۔ جہاں جاتے ہیں ہمارے دکھ اور تکلیفیں بدستور رہتی ہیں۔ یہ سب کچھ محبوب کی محبت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی حقیقت کا ایک شاعر نے یوں اظہار کیا۔

ہمیں کوئی غم نہیں تھا غمِ عاشقی سے پہلے — نہ تھی دشمنی کسی سے تری دوستی سے پہلے

مشق

سوال 1 میر کی دوسری غزل کے قوافی اور ردیف کی نشاندہی کیجیے۔

میر تقی میر کی دوسری غزل کے قوافی مندرجہ ذیل ہیں۔ قرار، بہار، بار، شمار، نثار، شعار اور دو چار ہیں جب کہ "اے کاش" ردیف ہے۔

سوال 2 میر کی دونوں غزلوں کے مطلع لکھیں اور اُن کی تشریح کیجیے۔

پہلی غزل کا مطلع یہ ہے: جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا کل اس پہ یہیں شور ہے، پھر نوحہ گری کا

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے

گل کو ہوتا صبا، قرار اے کاش! رہتی ایک آدھ دن، بہار اے کاش!

سوال 3 مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب پر (✓) نشان لگائیں۔

(i) "جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا" اس مصرع سے شروع ہونے والی غزل کس شاعر کی ہے؟

(الف) علامہ اقبالؒ (ب) مولانا حالی (ج) آتش ✓ (د) میر تقی میر

(ii) "گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش" اس مصرع سے شروع ہونے والی غزل کس شاعر کی ہے؟

(الف) علامہ اقبالؒ (ب) مولانا حالی (ج) آتش ✓ (د) میر تقی میر

(iii) ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

یہ شعر غزل میں کیا ہے؟

(الف) مطلع ✓ (ب) مقطع (ج) قافیہ (د) ردیف

(iv) میر تقی میر کی وجہ شہرت کیا ہے؟

(الف) نظم گوئی (ب) مثنوی نگاری ✓ (ج) غزل گوئی (د) مزاحیہ شاعری

سوال 4 مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کے معنی لکھیں۔

الفاظ و تراکیب		معانی
تاج وری	:	تاج پہننا مراد بادشاہی، شہنشاہیت
بیداد گری	:	ظلم و ستم، سفاکی، جفا، ناانصافی
چراغ سحری	:	وہ چراغ جو بجھنے کے قریب ہو، مرنے کے قریب شخص
شش جہت	:	چھے اطراف (آگے پیچھے، اوپر نیچے، دائیں بائیں) کل کائنات
قرار	:	چین، سکون، آرام، اطمینان، ثبات، دوام

سوال 5: میر تقی میر کی کوئی اور غزل لکھیں اور اس سے مطلع اور مقطع الگ کر کے لکھیں۔ اس غزل کے قافیے اور ردیف بھی ترتیب وار لکھیں۔

جواب مندرجہ ذیل غزل میر تقی میر کی ہے۔

غزل

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں
آگے ہو میخانے کے نکلو عہد بادہ گساراں ہے

عشق کے میداں داروں میں بھی مرنے کا ہے وصف بہت
یعنی مصیبت ایسی اُٹھانا کار کار گزاراں ہے

دل ہے داغ جگر ہے ٹکڑے آنسو سارے خون ہوئے
لو ہو پانی ایک کرے یہ عشق لالہ زاراں ہے

کوہکن و مجنوں کی خاطر دشت و کوہ میں ہم نہ گئے
عشق میں ہم کو میر نہایت پاس عزت داراں ہے

غزل کا مطلع یہ ہے:

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

مقطع یہ ہے:

کوہکن و مجنوں کی خاطر دشت و کوہ میں ہم نہ گئے
عشق میں ہم کو میر نہایت پاس عزت داراں ہے

غزل میں استعمال قافیے: بہاراں، باد و باراں، بادہ گساراں، کار گزاراں، لالہ عذاراں اور عزت داراں ہیں، جب کہ ردیف "ہے" ہے۔